صد سالہ عرس سرکار آسیؔ غازی پوری ۱۴۳۴ھ کی مناسبت سے

حضرت علامہ آسیؔ غازی پوری کی شاعری

(نقد و نظر)

مجنوںؔ گورکھپوری

/aasighazipuri

جو آج سے پہلے جتنی بار دیوان شریف طبع ہوا ہے اس میں یہ کلام نہیں ہیں اضافہ شدہ کلام جن جن معتبر ہستیوں سے دستیاب ہوئے ہیں۔
مندرجہ ذیل میں ان کے حوالے دیئے گئے ہیں اور کچھ کلام تجلیاتِ آسی مصنفہ ڈاکٹر ڈی این چترویدی زاہد شعبۂ ہندی شری مرلی منوہر ٹاؤن پوسٹ گریجویٹ کالج بلیا سے اخذ کرکے دیئے گئے ہیں اور آخر میں شجرۂ منظوم سلسلۂ طیبہ چشتیہ احمدیہ بھی دیدیا گیا ہے تاکہ ارباب سوز و گداز اس سے مستفیض ہو سکیں۔ حتی الامکان تصحیح کا کافی خیال رکھا گیا ہے۔ اگر کچھ خامیاں رہ گئیں ہوں تو ناظرین کرام عفو سے کام لیں گے

ناچیز سراپا تقصیر سید امیر علی یٰسین شاہدی رشیدی عفی عنہ

شرفِ انتساب

نوٹ :- اراکین انجمن فیضانِ رشیدی اس کا ایصالِ ثواب عالی جناب حضرت سید محمد سعید شاہدی علیمی رشیدی خلیفہ و مجاز رشید الدین شہود الحق قدس سرہٗ العزیز کو تفویض کرتے ہیں۔

(۷)

نقد و نظر، حضرتِ علاّمہ آسی کی شاعری

اس قدر درد سے لبریز جو تقریر نہ ہو
سخنِ آسی شیدا غزلِ میر نہ ہو

میرے مقالے کا موضوع حضرت آسی غازی پوری کی شاعری اور ان کا وہ نرالا اندازِ تغزل ہے جس کی بناء پر خود شاعر کو احساس ہے کہ اس کی شاعری اکثر "غزلِ میر" کے رتبہ کو پہنچ جاتی ہے جیسا کہ اُس نے اپنے شعر میں ظاہر کر دیا ہے۔

دُنیا میں محرومی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ جس چیز کو چاہو وہ نہ ملے۔ دوسری یہ کہ ایک ملی ہوئی دولت کی صحیح اور کماحقہٗ قدر نہ کی جائے۔ اگر ایک طرف ایسوں کی تعداد بے شمار ہے جو عمر بھر اکسیر کی تلاش کرتے رہے اور نہ پا سکے تو دوسری طرف ایسوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں جن کو اکسیر ملنے کو تو بارہا ملی مگر وہ بیشتر اوقات اس کو خاک سمجھتے رہے۔ میں جب آسی غازی پوری کی شاعری پر غور کرتا ہوں اور پھر اس ناشناسی اور بیگانہ وشی کو دیکھتا ہوں جس کو اُردو شاعری کے نقادوں نے ان کے حق میں برتا ہے تو مجھے اِس دوسری ہی قسم کی محرومی کی مثال نظر آتی ہے۔

آج مجھے کوئی قابلِ قدر تاریخِ شعرِ اُردو ایسی یاد نہیں آتی جس میں آسی کی شاعری کا اعتراف کیا گیا ہو۔ مولانا عبدالسلام ندوی جیسا بالغ نظر اور ہمہ گیر مؤرخ دو جلدیں "شعر الہند" کی لکھ ڈالتا ہے اور مشکل سے کسی ایک جگہ آسی کا نام لے کر چُپ ہو جاتا ہے اور پھر نہ ان کی شاعری پر کوئی رائے دیتا ہے اور نہ ان کا ایک شعر درج کرتا ہے۔ کیا آسی کے سارے کلام میں ایک شعر بھی ایسا نہ نکل سکا جس کو تغزل یا تصوف یا کسی اور عنوان کے تحت مثالاً پیش کیا جا سکتا؟ کہا جا سکتا ہے کہ آسی کا مرتبہ شاعر سے بہت بلند تھا اور شاعری ان کے لیے باعثِ فخر نہ تھی۔ وہ خانقاہِ رشیدیہ کے سجادہ نشین تھے اور ایک صاحب باطن مرشد اور یہی اُن کی اصل بزرگی اور برگزیدگی ہے جس کے سامنے ان کی ساری شاعری شرما کر مُنہ چھپا لیتی ہے۔ یہ آسی خود کہتے تو ہم خاموش ہو جاتے یا پھر اگر کوئی ایسا مرید کہتا جو شاعری کا مبصر نہ ہوتا یا کم از کم شاعری پر تنقید کرنے نہ بیٹھا ہوتا تو بھی اس کو معاف کیا جا سکتا تھا لیکن ایک نقادِ ادب کو ایسا تجاہل زیبا نہیں۔ اُردو شاعری میں آسی کی شاعری کو شامل نہ کرنا صریح ظلم ہے۔ مانا کہ آسی کے لیے شاعری ننگ تھی لیکن ہمارے لیے تو ننگ نہیں ہے اور پھر آسی کے کلام میں جو سنجیدہ دردمندی اور جو متین گداز ہے وہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خود بھی مزہ لے کر شعر کہتے تھے اور شاعری کو ننگ و عار

کی چیز نہیں سمجھتے تھے۔

سب سے پہلے میں ان کی مشہور غزل کے دو شعر لیتا ہوں اور انہیں سے اس تبصرہ کا افتتاح کرتا ہوں۔ مطلع ہے۔

وصل ہے پر دل میں اب تک ذوقِ غم پیچیدہ ہے ۔۔ بلبلہ ہے عین دریا میں مگر نم دیدہ ہے

یہ شعر اگر سوچئے تو شعورِ محبت کی ایک خاص منزل کا پتہ دیتا ہے جو تصوف کے انفعالی سکون سے اتنا ہی دور ہے جتنا کہ نفسانیت کے اضطراری ہیجان سے۔ شاعر کو وصل اس وقت میسر ہوتا ہے جبکہ وہ ایک پوری عمر وصل کی تمنا میں کھو چکا ہے اور اس کی ایک خاص طبیعت بن چکی ہے۔ مہجوری کا غم سہتے سہتے اس کے اندر ایک ذوقِ غم پیدا ہو گیا ہے یعنی اب غم اس کا مزاج ہے اور اب اس کو وصل نصیب ہوتا ہے جبکہ وہ وصل سے لذت اندوز ہونے کی پوری صلاحیت نہیں رکھتا۔ نتیجہ ایک عبرت ناک کش مکش CONFLICT ہے جس کو ہر کس و ناکس نہیں سمجھ سکتا۔ ایک طرف تو وصل کی نشاط انگیزیاں ہیں دوسری طرف اس ذوقِ غم کا جواب بمنزلۂ فطرت ہے۔ مطالبہ یہ ہے کہ کسی چیز سے نشاط نہ حاصل کرو۔ اس کش مکش کو شاعر صرف لفظ 'پیچیدہ' سے ادا کرتا ہے۔ اب آپ اس لفظ کی بلاغت کا اندازہ کیجئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے لکھنؤ کے ایک دوست نے جو اردو تنقید نگاری میں کافی روشناس ہو چکے ہیں۔ ایک مرتبہ اسی شعر کو پڑھ کر اعتراض کے لہجہ میں پوچھا تھا آخر اس "ذوقِ پیچیدہ" کے کیا معنی ہیں؟' میں نے اُن کو بہت سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ کہہ نہیں سکتا کہ وہ سمجھ سکے یا نہیں مگر چپ ضرور ہو گئے۔ خیر اب دوسرے مصرع کی طرف آیئے۔ تشبیہات اور استعارات کی دنیا کا پورا جائزہ لے چکنے کے بعد بھی اس خاص حالت کی مصوری کے لیے اس سے زیادہ صحیح تشبیہ خیال میں نہیں آتی۔ تشبیہ یا استعارہ جب تک جامع اور مانع نہ ہو فنی اعتبار سے ہم اس کو مکمل نہیں کہہ سکتے۔ یہ بلبلہ کی تشبیہ جس طرح ہماری اس مخصوص حالت پر محیط ہو گئی ہے شاید کوئی دوسری تشبیہ نہ ہو سکتی۔

یہ کش مکش کوئی ایسی دنیا سے نرالی بات نہیں جو ہماری سمجھ میں نہ آئے لیکن عام انسان یا تو اس منزل تک پہنچنے کی تاب نہیں لاتا یا اگر پہنچ جاتا ہے تو عموماً اپنی حالت سے بے خبر رہتا ہے۔ شاعر کا کام ہمارے اندر آگاہی پیدا کرنا ہے۔ شاعر اور صوفی میں سب سے بڑا فرق یہی ہے۔ صوفی کے لیے اس کے اپنے واردات اور تجربات ہی سب کچھ ہوتے ہیں اور وہ انہیں میں کھویا رہتا ہے۔ برخلاف اس کے شاعر اپنے واردات اور تجربات کو اس وقت تک قابلِ قدر نہیں سمجھتا جب تک کہ وہ ان کو از سرِ نو پیدا کر کے دوسروں کے مطلب کی چیز نہ بنا دے۔ صوفی جب خبردار ہوتا ہے تو پھر ہم کو خود اس کی خبر نہیں لگتی۔ شاعر جب خبردار ہوتا ہے تو وہ دوسروں کو بھی خبردار کرنے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ آسی کے شعر کا یہی

اثر ہوتا ہے کہ ہم خود اپنی واقعی یا امکانی حالت سے آگاہ ہو کر اس پر عبور پا جاتے ہیں

میں نے سب سے پہلے اس شعر کو اس لئے منتخب کیا کہ اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خود شاعر کس منزل پر ہے۔ یہ وہ منزل ہے جہاں نہ محض صوفی پہنچ سکتا ہے نہ محض شاعر بلکہ صرف وہ شخص پہنچ سکتا ہے جو صوفی اور شاعر دونوں ہو اور جس نے تصوف اور شاعری کو ملا کر ایک آہنگ بنا لیا ہو۔ آسی مجھے مجاز اور حقیقت کا ایک نہایت خوشگوار تصفیہ معلوم ہوتے ہیں ان کی شاعری اس سطح سے ہوتی ہے جہاں مجاز حقیقت اور حقیقت مجاز ہے۔ خود شاعر اپنے اندر اس کا احساس پاتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے : دنیا میں اٹھا لائے گی فردوس بریں کو بدمستیٔ صہبا و مزامیر ہماری

یہی وجہ ہے کہ آسی کے حال میں قال کا مزہ ہوتا ہے اور ان کے قال میں حال کا کیف۔ ان کی شاعری کی ایک عام خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اشعار کو ہر سطح کا آدمی حسبِ توفیق دل نشین پاتا ہے اور ان سے کیف اندوز ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اب وہ دوسرا شعر لیجئے جو اسی غزل کا مقطع ہے جس کے پہلے شعر سے میں نے ابتدا کی تھی۔ حشر میں منہ پھیر کر کہنا کسی کا ہائے ہائے آسیٔ گستاخ کا ہر جرم نابخشیدہ ہے

مجاز میں حقیقت کو دیکھنا ایک بہت پرانی سی رسم ہو گئی ہے یہ کہنے والے دنیا میں بہت ملیں گے ۔ مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بتخانہ تھا ہم بھی مہمان تھے ایک تو ہی صاحب خانہ تھا

لیکن حقیقت کو مجاز کی نت نئی رنگینیوں سے معمور اور پُر کیف بنانے کے لئے ایک خاص بصیرت درکار ہے۔ مجاز میں حقیقت کا نظر آنا تو پھر بھی دونوں میں ایک محسوس فرق کو باقی رکھتا ہے لیکن حقیقت میں مجاز دیکھنا دراصل دونوں کو ایک محسوس کرنا ہے۔ آسی نے اپنے شعر میں یہی کیا ہے، پڑھتے ہی ہر مدرس کہہ دے گا کہ شعر میں حشر، داورِ حشر اور اپنی گنہ گاریوں کا ایک مرقع پیش کیا گیا ہے لیکن شعر کو جو چیز اسی قبیل کے اور سینکڑوں اشعار سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کی بلیغ مجازیت SYMBOLISM یا تمثیلیت ALLEGORISM ہے اور اسی نے اس کو ہر شخص کے حالات اور جذبات سے قریب اور مانوس رکھا ہے۔ شاعر نے عارفانہ وجدانات کو عاشقانہ واردات بنا دیا ہے اور اسی کو اپنی اپنی توفیق اور اپنی اپنی بصیرت پر چھوڑ دیا ہے کہ داورِ حشر کو

جو جی چاہے سمجھ لو۔ ہمارے لئے اس کی بھی پوری گنجائش کہ ہم اس ہستی کو جزا اور سزا کا مالک سمجھیں جو اس زندگی میں ہمارے دل کا مدعا رہ چکی ہو اور جس نے اس دنیا میں ہماری تمنا کی گستاخیوں اور بے باکیوں کو کبھی نہ بخشا ہے۔ ریاض مرحوم کا ایک شعر ہے۔

• رہا ہے جو اس دل میں ہنگامہ آرا   وہی جلوہ آرائے محشر نہ نکلے

ریاض کے تخیل میں جو بات گمان و تذبذب رہ گئی تھی وہ آسی کے مشاہدہ میں آگئی ہے اور عین الیقین ہوگئی ہے۔ داورِ حشر سے ہم کوئی اجنبیت نہیں محسوس کرتے اس لئے کہ وہ تو ہمارا وہی قدیم محبوب ہے جو اپنی تمام بے وفائیوں کے باوجود زندگی میں ہمارے سارے حرکات و سکنات کا کارفرما رہ چکا ہے۔ اگر آسی فطرتاً شاعر نہ ہوتے اگر وہ محض ایک عارفِ کامل ہوتے تو ایک ایسے تصورِ مجرد کی اتنی کامیابی مصور کاری کر سکتے کہ ہر شخص کو وہ ایک ایسا امکان معلوم ہونے لگے جس کو واقعہ کی صورت اختیار کرتے دیر نہیں لگتی ۔ اسی غزل کے بعض اور اشعار سننے کے لائق ہیں ۔

• آنکھیں تجھ کو ڈھونڈھتی ہیں دل ترا گرویدہ ہے   جلوہ تیرا دیدہ ہے صورت تری نادیدہ ہے

انگریزی کے مشہور نقاد ہیزلٹ HAZLITT نے سچ کہا ہے کہ شاعری تخیل اور جذبات کی زبان ہوتی ہے۔" اور میرا خیال ہے کہ اگر منطق یا ریاضیات کو بھی اس زبان میں پیش کیا جائے تو وہ شاعری ہو جائے ۔ شاعری اور منطق میں سوائے اس کے اور کوئی فرق نہیں کہ منطق کی زبان اور اس کے تصورات جذبات و تخیل سے یک قلم عاری ہوتے ہیں۔ بہر کیف ذرا آسی کے اس "تجھ کو" کو ملاحظہ کیجئے جس کو ان کی آنکھیں ڈھونڈھتی رہتی ہیں ۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ صوفیوں کا وہی پرانا رسمی معشوق ہوگا جس کو شاہدِ ازل کہتے ہیں لیکن آسی کے اندازِ تخاطب میں جو بے تکلفی جو والہانہ سادگی اور جو عاشقی وارفتگی پائی جاتی ہے اس نے اس شاہدِ ازل کو ہر شخص کا محبوب بنا دیا ہے اور ہم آپ سب محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہماری زندگی میں ایسے تخاطب اور تکلم کا موقع بارہا آچکا ہے۔

دوسرا شعر خالص تصوف اور معرفت کا ہے لیکن اس میں بھی مجاز کی پوری رنگینیاں موجود ہیں اور اس بت پرستی کی لاج رکھ لی گئی ہے جو انسان کی فطرت اصلی ہے

• اتنے بت خانوں میں سجدے ایک کعبہ کے عوض   کفر تو اسلام سے بڑھ کر ترا گرویدہ ہے

یہ اس غزل کے اشعار تھے جس سے ہر وہ شخص واقف ہے جو اردو شاعری کا صحیح مذاق رکھتا ہے اب قبل اس کے کہ ہم آسی کے اور اشعار کی طرف متوجہ ہوں ان کے متعلق چند اہم رسمی باتوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔

آسی کا سلسلۂ تلمذ ناسخ سے ملتا ہے اور جہاں تک شاعری کے اسالیب و شعر کا تعلق ہے وہ لکھنوی دبستان کے تربیت یافتہ ہیں چنانچہ ان کے دیوان میں ایسے اشعار بھی ہیں جن کو آج کل کے روشن خیال نقاد محض اردو شاعری کے مزخرفات کہہ کر الگ کر دیں گے اور جن میں سوائے مناسبات و رعایات کے اور کچھ نہیں ہے اور اس سے انکار نہیں کہ یہ اشعار صرف زمین اور ردیف و قافیہ بنانے کے لیے کہے گئے ہیں۔ یہ اشعار کچھ شاہ نصیر، ذوق، ناسخ اور رشک ہی کو زیب دے سکتے تھے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

کہا یہ دیکھ کر خالِ بتِ بے پیر کا دانا
الٰہی اس کو تو کرنا مری تقدیر کا دانا

جو دانا ہے تو دیوانوں کے قدموں سے تو لپٹا رہ
مسلسل یہ صدا دیتا ہے ہر زنجیر کا دانا

گلوے خشک خواہاں ہے دمِ تکبیر پانی کا
ذبیحہ سے نہ کر بخل اے دمِ شمشیر پانی کا

خدنگِ آہ نکلا یا کلیجہ ہو گیا پانی
ہوائی تیر سنتے تھے یہ دیکھا تیر پانی کا

آہ بھی آج ہوئی ہم سفرِ اشک نئی
کیا ملی سوئے فلک رہ گذرِ اشک نئی

آج تو گریۂ عاشق نے کئے دل ٹکڑے
ہاتھ آئے کوئی تیغِ اثرِ اشک نئی

کوششِ دستِ مژہ نے اسے کب روکا تھا
آج ہے طرزِ گرفتِ گہرِ اشک نئی

اس انداز کے اشعار دیوانِ آسی میں کم نہیں ہیں مگر یہ ان کی شاعری نہیں ہے بلکہ صرف

مشق و ریاضت ہے جس طرح وہ خانقاہ رشیدیہ کی سجادہ نشینی اور اس کے تمام رسوم و روایات کی پابندی کو اپنی روح کی تہذیب و تحسین کے لیے ضروری سمجھتے تھے اسی طرح انہوں نے اپنے مدرسۂ شاعری کے تمام شرائط و لوازم کو پورا کرنا شاعری کی تکمیل کے لیے اپنا نصاب بنا لیا تھا۔ آسیؔ کے مریدین اُن اشعار کو جو ابھی سنائے گئے ہیں آسیؔ کی ابتدائی مشق بتاتے ہیں، اور یہ بہت بڑی حد تک صحیح ہے لیکن ان کی حقیقت صرف اسی قدر نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ دراصل ان بندشوں اور ضابطوں کی یادگاریں ہیں جس سے آسیؔ نے اپنے نفسِ شعری کی تربیت کی ہے۔

آسیؔ نے زبان، تشبیہات و استعارات اور دیگر رعایات وہی استعمال کئے ہیں جو روزِ اوّل سے ہمارے قدیم شعراء استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن انہوں نے ان روایاتِ قدیمہ میں جو نئی جان ڈالی ہے اس کی دوسری مثال مشکل سے ملے گی۔ جو تاثیر آسیؔ نے اپنے کلام میں ان رسوم و تکلفات سے پیدا کی ہے وہ انتہائے خلوص و سادگی کے باوجود بھی کسی دوسرے کو مشکل ہی سے میسّر ہو سکتی تھی۔ مجھے یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں ہے کہ آسیؔ دبستانِ ناسخؔ کے میرؔ ہیں۔ خود ان کو بھی اس کا احساس ہے مگر آخر اس تاثیر کا راز کیا ہے؟ آسیؔ کی باتیں اس قدر درد سے لبریز کیوں ہوتی ہیں اور وہ ہم پر چھا کیوں جاتی ہیں؟

آسیؔ کو یہ راز معلوم تھا کہ حقیقت کبھی عُریاں منظرِ عام پر نہیں لائی جا سکتی۔ حقیقت سے میری مراد محض معرفتِ خداوندی نہیں ہے بلکہ ہر وہ حالت ہے جو ہم پر گزرے۔ بہرحال آسیؔ نے تشبیہات اور استعارات اور دیگر صنائع و بدائع سے وہی کام لیا ہے جو اہلِ معرفت رموز و علامات سے لیتے ہیں۔ وہ ہر کیفیت اور ہر تاثر کو اس قدر آراستہ و پیراستہ کر کے سامنے لاتے ہیں کہ ظاہر پرست ان کو محض خرافاتِ شاعری سمجھتے ہیں لیکن اہلِ بینش کے دلوں پر بن جاتی ہے اس لیے کہ وہ دیکھ لیتے ہیں کہ شاعر دراصل کس حال میں ہے اور اس بناؤ سنگار سے اس کا اصل مقصد کیا ہے۔

آسیؔ کے لیے یہ تمام رموز و کنایات، یہ سارے تشبیہات و استعارات زندہ حقیقتیں ہیں۔ میں یہاں ایک شعر سے اپنا مطلب واضح کرنا چاہتا ہوں اور وہ آسیؔ کے جاننے والوں میں کافی مشہور شعر ہے۔

تابِ دیدار جو لائے مجھے وہ دل دینا
مُنہ قیامت میں دکھا سکنے کے قابل دینا

ایسوں کی تعداد کافی ہے جو شعر سُنتے ہی یہ کہہ دیں گے "میاں اس شعر میں رکھا ہی کیا ہے، وہی قیامت کا ذکر۔ وہی تابِ دیدار کا رونا۔ وہی دقیانوسیت"۔ میں اس لیے یہ کہنے کی جرأت

کر رہا ہوں کہ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں جب کہ یوم حالیؔ کے سلسلے میں میں پانی پت جا رہا تھا تو اپنے چند ہمسفر احباب ملے اس شعر پر اس قسم کی رائے سنی تھی مجھے بھی اتفاق ہے کہ ہاں سب باتیں وہی ہیں قیامت بھی وہی۔ تابِ دیدار بھی وہی۔ لیکن وہی دقیانوسیت کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ شاعر اچھی طرح جانتا ہے کہ دیدار کی تاب لانا دنیا میں سب سے زیادہ سخت اور دشوار کام ہے۔ ذرا ہم آپ سب اپنی اپنی زندگی میں تبصرہ کر جائیں۔ ہم میں سے کتنے ہیں جن کو اس دیدار سے سابقہ پڑا ہے اور جو اس کی تاب لا سکے ہیں؟ وہ قیسؔ و فرہادؔ ہوں یا کلیمؔ و منصورؔ اپنی تنگ ظرفی اور بے تابی کی بدولت محبوب کے جلووں کے سامنے شرمندہ سبھی کو ہونا پڑتا ہے۔ یہ شرمندگی انسان کا مقدر معلوم ہوتی ہے۔ آسیؔ کی لغت میں قیامت نام ہے دوسرے روز دیدار کا۔ ان کے لئے قیامت کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ محبوب سے دوبارہ مگر آخری بار ملاقات ہو گی۔ یہ محض خیال نہیں بلکہ آسیؔ کا ایمان ہے۔ حشر کی غایت سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ محبوب کا دیدار نصیب ہو۔ اب ذرا سوچئے کہ ایک عاشقِ نامراد جو زندگی میں اپنی تابِ نظارہ سے دھوکا کھا چکا ہو اور صرف اپنے ظرف کے بدولت جلوۂ یار سے محروم رہ گیا ہو اور جس کو ابھی یہ اندیشہ لگا ہو کہ کہیں پھر ایسا ہی نہ ہو سوائے اس کے اور کیا دعا مانگ سکتا ہے کہ ؎ تابِ دیدار جو لائے مجھے وہ دل دینا۔

اور یہ دعا کچھ عجیب قسم کا خلوص اپنے اندر رکھتی ہے جس کا اثر زبان تک موجود ہے پیرایۂ اظہار میں جو گداختگی اور جو گھلاوٹ پائی جاتی ہے اس سے غیر شعوری طور پر سننے والے کو اپنی گزری ہوئی حالت یاد آ جاتی ہے اور وہ بے اختیار دعا میں آسیؔ کا ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ سنتے ہیں لبِ اظہار کا یہ معجزہ کبھی مسیحا کو ملا تھا۔

آسیؔ نے قیامت کے پامال تصور میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی ہے ان کے دیوان میں قیامت کا بار بار ذکر آتا ہے اور جب ذکر آتا ہے تو مخصوص تصور اور مخصوص اعتقاد کے ساتھ۔ قیامت اس دن کا نام ہے جب کہ اس کاروبارِ عاشقی کی تکمیل ہو گی جو اس زندگی میں نامکمل رہ جاتا ہے اس کو نفسیات کی اصطلاح میں ان داعیات و میلانات کی تکمیل کہتے ہیں۔ جو چند در چند اسباب و عوارض کی وجہ سے ہماری روزمرّہ کی زندگی

میں پورے نہیں ہونے پاتے۔ ہماری ان خون گشتہ حسرتوں اور رد کردہ تمناؤں کی تکمیل ہمیشہ پردے میں ہوتی ہے۔ ہمارے خواب اس تکمیل آرزو کی ایک خاص صورت ہیں۔ خواب میں ہمارا نفس آزاد و خود مختار ہوتا ہے اور محال سے محال آرزو کو آسودہ کر سکتا ہے۔ آسی قیامت اور خواب دونوں کو ایک ہی عنوان کی چیزیں سمجھتے ہیں۔ کیسے ہیں اور کس یقین کے ساتھ کہتے ہیں: میری آنکھیں اور دیدار آپ کا   یا قیامت آ گئی یا خواب ہے

ایک دوسری غزل میں کہتے ہیں: رو کے آسی پوچھتا تھا کب قیامت آئے گی   کس طرح کہیے کہ وہ نیرا تمنائی نہ تھا

تمنا اور انتظار کا اس سے زیادہ شدید اور بلیغ ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے اور پھر قیامت کا اس سے زیادہ متعین اور واضح تصور کہاں ملے گا؟ کبھی کبھی آسی کا یقین متزلزل بھی ہو جاتا ہے اور قیامت کے دن کی کامیابی کی طرف سے بھی وہ کچھ بدگمان اور مایوس ہو جاتے ہیں مثلاً

اس شعر میں: وہ کاش اتنا قیامت میں تو پوچھیں   کہاں ہے آسی بے دل ہمارا

یا یہ شعر: وہاں بھی وعدۂ دیدار اسطرح ٹالا   کہ خاص لوگ طلب ہونگے بارِ عام کے بعد

مگر اساسی تصور وہی ہے یعنی قیامت اور دیدار کے درمیان ایک ازلی نسبت ہے اور قیامت تو بہت بعد کی چیز ہے۔ آسی اس سے ایک منزل پہلے شب گور کو بھی ملاقات کی رات سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں:

اب تو پھولے نہ سمائیں گے کفن میں آسی   ہے شب گور بھی اس گل کی ملاقات کی رات

موت اور بعد الموت کے متعلق آسی کے علاوہ اگر کسی کو ایسا یقین اور اطمینان نصیب تھا تو وہ سقراط ہی تھا اور اگر اسی کا یہ یقین پورا نہ ہوا تو قیامت سے بھی کچھ حاصل نہیں۔ نظر و ناظر و منظور نہ جب ایک ہوئے   کیا بلا روزِ قیامت میں ندامت کے سوا

پھر قیامت میں وہی ندامت ہوگی جو ایک بار زندگی میں ہو چکی ہے۔ آسی زندگی کو ایک طویل میعادِ انتظار و امید قرار دیتے ہیں جو قیامت کے دن پوری ہوگی چنانچہ کہتے ہیں: کچھ ہمیں سمجھیں گے یا روز قیامت والے   جس طرح کٹتی ہے امید ملاقات کی رات

اور اس شعر میں تو وہ نہایت لطیف اور بلیغ کنایہ میں واضح کر دیا ہے کہ بچھڑے ہوئے محبوب سے ملنا اب قیامت ہی میں ہوگا۔

الٰہی آسیٔ بے تاب کس سے چھوٹا ہے   کہ خط میں روزِ قیامت لکھا ہے نام کے بعد

اگر قیامت یہی ہے تو اس کو عشاق کی عید سمجھیے۔ قیامت کی اصل غایت تو جیسا کہ دکھایا جا چکا ہے یہی ہے کہ محبوب کی ملاقات میسّر ہو لیکن اس کا بھی اندیشہ ہے کہ ہم مایوس و ناکام رہ جائیں اور قیامت کے دن بھی کچھ نہ ہو سکے اس لئے کہ اپنے اپنے ظرف اور اپنی اپنی تاب کی شرط لگی ہوئی ہے ممکن ہے کہ عین وقت پر ہمارا ظرف پھر ہمارے ساتھ کمی کر جائے۔ اس خیال سے آسی کا دل کانپ اٹھتا ہے۔ ایک رباعی میں کہتے ہیں

پھر بادۂ تندِ غصّہ پینا ہوگا   پھر ٹکڑے جگر کے ساتھ سینا ہوگا
جینے نے یہاں کے مار ڈالا آسی   سنتے ہیں کہ پھر حشر میں جینا ہوگا

بے ساختہ اس جگہ یقینؔ کا ایک شعر یاد آ گیا۔

دوبارہ زندگی کرنا مصیبت اس کو کہتے ہیں   پھر اٹھنا بے دماغوں کا قیامت اسکو کہتے ہیں

لیکن یقینؔ اور آسیؔ میں وہی فرق ہے جو شوریدگی اور پختہ مغزی میں ہوا کرتا ہے بہر حال قیامت کے دن اور کچھ ہو یا نہ ہو اتنا تو ہونا ہی ہے کہ ہماری زندگی کا قضیہ جہاں سے چھوٹا تھا وہیں سے پھر شروع ہوگا۔

خبر جو محشر میں بھیڑ کی ہے وہ حسرتوں کا ہجوم ہوگا   وہ داغ ہوگا کسی کے دل کا جو چمکے گا آفتاب ہو کر

اور حسرتوں کا یہ ہجوم زیادہ تر ہمارے جذبۂ عشق کی نیابت کرے گا اس لیے کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زندگی میں جو جذبہ سب سے زیادہ نامکمل اور ناآسودہ رہ جاتا ہے وہ ہمارا جذبۂ عشق ہی ہوتا ہے۔ ہماری جو تخییل سب سے زیادہ ناقص رہ جاتی ہے وہ محبت کی تخئیل ہے اور ہم مجبوراً اس کو قیامت کے دن کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔

دورِ جدید کی مہذّب اور تعلیم یافتہ دنیا ایسے خیالات کی فرسودگی پر قہقہہ لگاتی ہے۔ اس کو نہیں معلوم کہ کسی چیز کی فرسودگی اس کے ابطال کی دلیل نہیں ہوا کرتی حقیقت جتنی ہی زیادہ پرانی ہوگی اتنی ہی زیادہ سنگین بھی ہوگی۔ حشر و معاد کا تصور انسان کی فطرت میں ہے۔ دنیا میں جتنے مذاہب ظہور پذیر ہوئے۔ ان سب کی بنیاد اسی سوال پر رہی ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ مومن ہو یا منکر، ملحد ہو یا صوفی دہریہ ہو یا متکلم اگر وہ اپنے نفس کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لے تو معلوم ہوگا کہ

شعوری ہو یا غیر شعوری طور پر اس کے اندر یہ اندیشہ موجود ہے کہ جس زندگی کی ابتدا یوں ہوئی اور جو یوں نامکمل رہ گئی اس کا موت کے بعد کیا حشر ہوگا۔ ظاہر پرست یورپ جو مادیت اور افادیت کا مبلغ اور علم بردار سمجھا جاتا ہے آج دنیا میں ہر ملک سے زیادہ اس سوال کی طرف متوجہ نظر آتا ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ آج یورپ میں جن علوم کا سب سے زیادہ چرچا ہے وہ تحلیلِ نفسی اور تحقیقِ روحانی ہیں اور یہ دونوں اس باب میں متفق ہیں کہ مرنے کے بعد ہمارے وہ میلانات و داعیات ابھریں گے جو اس زندگی میں دب کر رہ گئے اور جو علی الاعلان آسودہ نہ کئے جا سکے یہ بھی سب مانتے ہیں کہ ان میلانات میں سب سے زیادہ اہم اور ناقابلِ تردید وہ ہیں جن کا تعلق ہمارے جذبۂ زوجی یا شعورِ جنسی سے ہے۔ وہ اس کو شعورِ جنسی کہتے ہیں۔ ہم اس کو زیادہ لطیف اور پُرکیف پاتے ہیں اور عشق کہتے ہیں۔ بہرحال یہ مسلم ہے کہ ہمارے وہ جذبات ہماری روح سے لپٹے رہیں گے جو دنیا میں خاطر خواہ آسودہ نہ ہو سکے پھر اگر آسیؔ یہ کہتے ہیں تو کیا غلط ہے۔

غبار ہو کے بھی آسیؔ پھروگے آوارا جنونِ عشق سے ممکن نہیں ہے چھٹکارا

آج کل حیاتِ انسانی کا سب سے زیادہ سنگین مسئلہ یہی ہے اور شاید یہ ہبوطِ آدم سے لیکر اب تک ایسا ہی رہا ہے۔ اب ہم آسیؔ کے دو چار اور اشعار ایسے سناتے ہیں جن کا موضوع موت اور قیامت ہے اور جو ہمارے خیال کی مزید تشریح و توثیق کرتے ہیں: فتنہ زارِ حشر سب سمجھے ہیں جس میدان کو دامنِ نازِ نگہ کا گوشۂ جنبیدہ ہے

ہم سے بے کل سے وعدۂ فردا
بات کرتے ہو تم قیامت کی

اے شبِ گور وہ بے تابیِ شبہائے فراق
آج آرام سے سونا مری تقدیر میں تھا

مآل اس کا قیامت ہے قیامت
وہ آفت کی جگہ ہے دارِ فانی

اب تو دیدار دکھا دیجئے تقصیر معاف
ہو گیا وعدۂ فردا ہی قیامت مجھ کو

ساتھ چھوڑا سفرِ ملکِ عدم میں سب نے
لپٹی جاتی ہے مگر حسرتِ دیدار ہنوز

آپ کہتے ہوں گے کہ ہم نے صرف ایک عنوان یعنی قیامت پر اتنا وقت لے لیا۔ مجھے خود اس کا اعتراف ہے لیکن میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ آسیؔ کی ذات اور ان کی شاعری کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ ان کے چند مخصوص اور متعین تصورات و اعتقادات ہیں جن میں آسیؔ کو اسی قدر غلو اور انہماک ہے جس قدر کسی کٹر سے کٹر مذہبی شخص کو اپنے مذہب میں ہو سکتا ہے۔ آپ لوگوں کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ آسیؔ قیامت کا ذکر محض شاعری کی رسم ادا کرنے کے لیے نہیں کرتے۔ ان کے ذہن میں قیامت کا ایک خاص تصوّر ہے اور وہ اس کی بابت ایک اعتقاد رکھتے ہیں۔ یہی آسیؔ کی ساری شاعری ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اور جب کہتے ہیں ایک خاص تصور کے ماتحت اور ایک شدید اعتقاد کے ساتھ کہتے ہیں جس میں ان کو انہماک ہوتا ہے۔ مثلاً

دل دیا جس نے کسی کو وہ ہوا صاحبِ دل
ہاتھ آجاتی ہے کھو دینے سے دولت دل کی

یا مثلاً یہ شعر:

کوئے محبوب سے کوئی بھی نکل سکتا ہے
اپنے اوہام ہوئے وادیِ غربت مجھ کو

شعر میں تشبیہ سے کام لیا گیا ہے اور تشبیہ بھی ایسی جس کو انوکھی کہنا پڑتا ہے۔ مگر یہ آسیؔ کے تخیل کی شدید ہویت جس نے تشبیہ کو عین واقعہ بنا دیا ہے اور مشبہ اور مشبہ بہ میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہنے دیا ہے۔ "اوہام" کو "وادیِ غربت" بتانا۔ اگر کوئی اور کہتا تو ہم اس کو محض شاعری یعنی ایک دور از کار خیال کہتے لیکن آسیؔ کا خلوص جذب اور زبان و دل کی یک آہنگی ہے جس نے اس نرالے تخیل کو ہمارے لیے اقلیدس کا ایک ایسا مقالہ بنا دیا ہے جو کسی ثبوت کا محتاج نہیں ہے۔ ہم سب سنتے ہی مان لیتے ہیں کہ ہمارے "اوہام" ہی ہمارے لیے "وادیِ غربت" بنے۔ اردو میں اس قبیل کا صرف ایک شعر مجھے یاد ہے جو میرؔ کے مشہور اشعار میں سے ہے۔

عمر بھر کوچۂ دل دار سے جایا نہ گیا
اس کی دیوار کا سر سے مرے سایا نہ گیا

آسی نے ہم کو اس خطرہ سے بھی آگاہ کر دیا ہے کہ ہمارے "اوہام" ہم کو کوچۂ دل دار سے نکال بھی سکتے ہیں اور "اس کی دیوار کا سایہ" ہمارے سر سے جا بھی سکتا ہے۔

آسی رمز و کنایہ کے قائل ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ "دشنہ و خنجر" یا "بادہ و ساغر" کے بغیر گفتگو میں کام نہیں چلتا۔ وہ تشبیہ و استعارہ کو بیانِ حقیقت کے لیے ضروری سمجھتے ہیں یہ کہنا شاید زبردستی نہ ہو کہ آسی مجاز کو "قنطرۃ الحقیقت" نہیں بلکہ عین حقیقت مانتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کی شاعری میں، جو کافی حد تک تشبیہ و استعارہ اور رمز و کنایہ کی شاعری ہے، اتنی تاثیر اور لذت نہ ہوتی کہ اس پر "غزلِ میر" کا اطلاق ہو سکے۔

آسی کے کلام کی مجموعی خصوصیت گستگی اور تبتل ہے یعنی سب کچھ چھوڑ کر محبوب کی طرف نہ صرف آجاؤ بلکہ اسی میں محو ہو جاؤ۔ لیکن یہ محویت کوئی مجہولی کیفیت نہیں ہے۔ آسی کے وہاں عشق ایک جداگانہ مذہب ہو گیا ہے۔ اور ان کی شاعری کو اس مذہب کی انجیل سمجھنا چاہیے۔ وہ عشق کی بشارت لے کر آئے ہیں اور ان کا پیغام یہ ہے کہ بے عشق زندگی بے کیف ہے۔ ایک شعر میں کہتے ہیں،

عین معنی ہے وہ دل عاشقِ معنی جو ہوا
ہائے وہ لوگ جو دل دادۂ صورت بھی نہیں

بے ساختہ حافظ کا یہ شعر یاد آ گیا۔

بروزِ حشر ندانم چہ عذر خواہی گفت
کسے کہ دوست ندارد جمالِ زیبا را

آسی نے عشق کو محض ایک وجودِ بے کیف یا انفعالیت نہیں سمجھا ہے۔ عشق نام ہے محبوب میں جذب ہو کر یکسر حرکت و اضطراب ہو جانے کا اور یہ حرکت و اضطراب کوئی عصبی ہیجان نہیں ہے۔ عشق سے مراد وہ مستقل اور پیہم سعی و عمل ہے جس کا تعلق بیک وقت جسم، دل، دماغ، روح، غرضکہ انسان کی ساری ہستی سے ہے۔ عشق اور حسن دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ایک دوسرے سے جدا نہیں کئے جا سکتے۔ دونوں کو مل کر انسان کے مقدر کی تحسین و تکمیل کرنا ہے اس لیے عشق مجہولیت اور بے کیفی سے اسی قدر دور ہے جس قدر کہ حسن، حسن اور عشق ایک دوسرے کو کبھی مردہ نہیں ہونے دیتے۔ دونوں ایک دوسرے کے اندر ذوقِ عمل اور نشاطِ کار پیدا کئے رہتے ہیں۔ یہ تین شعر سنیے اور آسی کے پیغام کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

ذوق افزائے جنوں ہے اشتیاق ہم مجھے
دل مرا درکار اُس کو اور اُس کا غم مجھے
میں وہی سمجھا ملی جب کسوتِ آدم مجھے
عالمِ غم میں بنایا مرکزِ عالم مجھے
داقعی صہبائے ذوقِ جلوہ ہستی سوز ہے
وجد میں لاتی ہے آسی حالتِ شبنم مجھے

ذرا اس نویدِ کامرانی کو بھی سنئے:

ہوا کے رُخ تو ذرا آ کے بیٹھ جا اے قیس
نسیمِ صبح نے چھیڑا ہے زلفِ لیلیٰ کو

آسی کے دل میں جو دائمی کیف و نشاط موجود ہے اس کا فیض یہ ہے کہ حسن و عشق کے بازار کو کبھی سرد نہیں پاتے۔

حسن کی کم نہ ہوئی گرمیِ بازار ہنوز۔
نقدِ جاں تک لیے پھرتے ہیں خریدار ہنوز

آسی عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی کی بحث میں نہیں پڑتے۔ عشق بہر حال عشق ہے جس میں "دردِ سر" نہیں بلکہ "دردِ دل" اور "دردِ جگر" درکار ہوتا ہے۔ یہ عشق آخر ہو کس کے ساتھ؟ یہ اپنے اپنے حوصلہ اور اپنی اپنی توفیق پر منحصر ہے۔ بلجیم کے مشہور صوفی تمثیل نگار مارس ماٹرلنک کا خیال ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس نے عشق کیا ہو اور عشق سے اپنی روح کی عظمت اور برگزیدگی میں اضافہ نہ کیا ہو۔ چاہے اس کا عشق کتنا ہی سفلی کیوں نہ ہو۔ آسی نے کھلے الفاظ میں کہیں یہ تلقین نہیں کی ہے۔ مگر ان کی شاعری کا عام لہجہ اور عام اشارہ یہی ہے کہ عشق مقصود بالذات ہے جو تمام اضافتوں سے بالاتر ہے جو کسی کے ساتھ منسوب ہو سکتا ہے۔ جب تک عشق عشق ہے ہم کو یہ سوال نہ اٹھانا چاہیے کہ کس کے ساتھ ہے۔

مردم از عشق مرادِ دو جہاں می جستند
صائب از عشق ہماں عشق تمنا می کرد

یہی وجہ ہے کہ ہر پڑھنے والا عام اس سے کہ وہ شعورِ محبت کی کس منزل پر ہے آسی کی شاعری کو اپنے سے بہت قریب پاتا ہے اور اس کو ماننا پڑتا ہے۔

آسیِ مست کا کلام سنو
وعظ کیا پند کیا نصیحت کیا

مشرق کے صوفی شاعروں میں صرف دو ہستیاں ایسی نظر آتی ہیں جنہوں نے مجاز کی حقیقت اور قدسیت کو کما حقہ تسلیم کیا ہے اور جن کے مسلک کو "مجازیت" کہا جا سکتا ہے۔ ایک تو حافظ۔ دوسرے آسی۔ درد کے تصوف کی دھوم محض تاریخِ شعرِ اردو کی ایک رسم ہے۔ وہ خود کتنے ہی زبردست صوفی کیوں نہ رہے ہوں لیکن شاعری میں ان کا شعورِ عشق بہت ادنیٰ سطح پر ہے اور وہ معاملۂ عشق میں محض ایک نوآموز معلوم ہوتے ہیں۔ آتش میں تصوف اور تغزل دونوں کے قوی اور شدید امکانات موجود تھے لیکن زمانہ اور ماحول نے نہ تو ان کے تصوف کو اچھی طرح نمایاں ہونے دیا نہ تغزل کو۔ آسی کے وہاں تصوف اور تغزل حقیقت اور مجاز دونوں ایک مزاج ہو کر نمایاں ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حقیقت والے اس کو حقیقت سمجھتے ہیں اور مجاز والے مجاز۔ مثال کے طور پر ایک شعر سنیے۔

بس تمہاری طرف سے جو کچھ ہو
میری سعی اور میری ہمت کیا

فوراً خیال "السعی منی والاتمام من اللہ تعالیٰ" کی طرف جاتا ہے، لیکن الفاظ میں جو سیدھا پن ہے اور لب و لہجہ میں جو ملائمت اور گداز ہے وہ اس شعر کو عام اور ہمہ گیر بنائے ہوئے ہے ایک دائم الخمر اپنے بازاری محبوب سے بھی یہی کہہ سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے محبوب کے ساتھ اتنا ہی خود فراموش ہو اور معیارِ عشق پر پورا اترتا ہو۔ اور آسی کا معیارِ عشق کیا ہے؟ وہ بھی سن لیجئے۔

عاشقی میں ہے محویت درکار
راحتِ وصل و رنجِ فرقت کیا

اسی غزل کا ایک اور شعر سننے سے تعلق رکھتا ہے:

نہ گرے اس نگاہ سے کوئی
اور افتاد کیا مصیبت کیا

اگر یہ خیال کسی اور شاعر کو سوجھتا جو رعایتِ لفظی کو ضروری سمجھتا تو یہ شعر الفاظ کی بازی گری ہو کر رہ جاتا اور اس میں کوئی تاثیر نہ ہوتی لیکن جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہو گیا ہو گا آسی کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ وہ تمام آرائش اور تکلف کے باوجود اپنے کلام کو اس تاثیر سے بھر دیتے ہیں جو خلوص اور سادگی سے پیدا ہوتی ہے۔ تشبیہات و استعارات کی شاعری دنیا میں بہت کم تاثیر کی شاعری ہو سکی ہے مگر آسی کے دل میں کیفیت پہلے ہوتی ہے اور تشبیہات و استعارات اور دوسرے مناسبات بعد کو سوجھتے ہیں اسی لیے ان کے تشبیہات و استعارات بھی ان کے جذبات و تاثرات کے لازمی عناصر بن جاتے ہیں اور صورت و معنی میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ جو شعر ابھی سنایا گیا ہے اس پر غور کیجئے۔

ظاہر ہے کہ "گرنا" اور "افتاد" میں رعایت ملحوظ ہے۔ لیکن شاعر خود اس قدر متاثر ہے اور اس رعایت کی واقعیت کو اس شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہے کہ آج ہر سننے والے کو اس کی واقعیت ایک نہایت عام بات معلوم ہو رہی ہے۔ لفظ اور معنی کو ایک کر دینا اس کو کہتے ہیں۔ "گرنے" کے لغوی معنی "گرنے" کے استعاری معنی "نگاہ سے گرنے" کا محاورہ۔ "افتاد" اور "مصیبت" سب ایک ہی حالت کے مختلف نام ہیں:

اس غزل کے دو اشعار اور سن لیجئے۔

جن میں چرچا نہ کچھ تمہارا ہو
ایسے احباب ایسی صحبت کیا

جاتے ہو جاؤ ہم بھی رخصت ہیں
ہجر میں زندگی کی مدت کیا

آسی کی ہر بات ہمارے دل میں تیر کی طرح اتر جاتی ہے اس لیے کہ وہ حال اور بیانِ حال میں کوئی فرق باقی نہیں رہنے دیتے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو:

جو رہی اور کوئی دم یہی حالت دل کی
آج ہے پہلوئے غم ناک سے رخصت دل کی

اگر کبھی بھی آپ کے دل کی یہ حالت رہ چکی ہے تو اب آپ کو معلوم ہوا ہو گا کہ اس حالت کو بیان کیسے کرتے ہیں۔ کسی قدیم مشرقی نقادِ سخن کا یہ خیال بہت صحیح ہے کہ اصلی شعر وہ ہے کہ ہر سننے والا سمجھے کہ یہ تو میں بھی کہہ سکتا تھا لیکن جب کہنے بیٹھے تو معلوم ہو کہ واقعی اس کے لیے کس دل سوزی اور جگر خراشی کی ضرورت ہے۔ آسی کا یہ شعر ایسا ہی ہے۔ اس غزل کے تین شعر اور پیش کرنا چاہتا ہوں:

کوچۂ یار سے گھبرا کے نکلنا کیسا تھا
دل کو شکوے ہیں مرے مجھ کو شکایت دل کی

اگر آپ کو زندگی میں کبھی بھی "کوچۂ یار" سے سابقہ رہا ہے اور اگر آپ کے اندر حسیتِ عشق کا کچھ بھی اثر باقی ہے تو آپ کے دل کو آپ سے اور آپ کو اپنے دل سے یہی شکایت ہو گی۔

اس شعر میں وحشتِ دل کا کیسا بے تکلف اور بے ریا نقشہ کھینچا ہے

گھر چھٹا شہر چھٹا کوچۂ دلدار چھٹا
کوہ و صحرا میں لیے پھرتی ہے وحشت دل کی

مقطع میں جس تسلیم و رضا کی ترغیب دی گئی ہے وہ منتہائے عشق ہے اور ہر عاشق کے مقدر کی چیز نہیں ہے:

راستہ چھوڑ دیا اس نے ادھر کا آسیؔ
کیوں بنی رہ گذرِ یار میں تربت دل کی

سیؔ کے کلام کے مطالعہ کے بعد ماں لینا پڑتا ہے کہ کامیاب ادب میں لفظ اور معنی کے درمیان کوئی دوئی نہیں رہتی۔ لفظ ہی معنی اور معنی ہی لفظ ہوتا ہے۔ شاعر کا کام نہ صرف یہ ہے کہ معنی کے لیے لفظ تلاش کرے بلکہ اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ لفظ کی معنوی کیفیت کو بڑھا دے۔ مسیح کا معجزہ کچھ اس سے زیادہ نہ تھا۔ الفاظ وہی تھے جو لغت میں صدیوں سے موجود تھے۔ صرف ان کی معنوی کیفیت اور معنوی شدت اتنی بڑھ گئی تھی کہ مُردوں میں بھی جان پڑ جاتی تھی۔ آسیؔ نے اپنے بہترین اشعار میں یہی کیا ہے۔ وہ فرسودہ سے فرسودہ الفاظ کو ایسے وقت اور ایسی ترکیب کے ساتھ لاتے ہیں اور اس کے اندر ایسی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ لفظ ہمارے لیے بالکل نیا ہو جاتا ہے۔ اس وقت مجھے ان کی ایک رُباعی یاد آ رہی ہے۔

غنچے! تجھے میری دل فگاری کی قسم
شبنم! تجھے میری اشک باری کی قسم
کس گل کی نسیمِ صبح خوشبو لائی
بے تاب ہے دل جنابِ باری کی قسم

ذرا اس "جنابِ باری" پر غور کیجئے گا۔ کس قدر عام اور پرانی اصطلاح ہے لیکن آسیؔ نے جیسا اس کو نئی معنوی کیفیت سے بھر دیا ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں یہ قسم نہ کھائی گئی ہوتی تو نہ شاعر اس حالت کو پوری طرح بیان کر سکتا اور نہ ہم خاطر خواہ اس سے متاثر ہو پاتے۔ شاعر کی زبان قسم کی تہذیب و تحسین کرتی چلی گئی ہے یہاں تک کہ اس کی قسم اس کی حالت پر محیط ہو گئی ہے۔

چند خالص استعاری انداز کے اشعار سُنیے جن میں صرف استعارہ سے کیف و جذب پیدا کیا گیا ہے۔

ناتوانوں کے سہارے کو ہے یہ بھی کافی
دامنِ لطفِ غبارِ پسِ محمل دینا

کیا اس شعر نے "غبارِ پسِ محمل" کو ہمارے لیے ایک جاندار حقیقت نہیں بنا دیا ہے ؟

یا یہ شعر۔

ذوق میں صورتِ موج آ کے فنا ہو جاؤں
کوئی بوسہ تو بھلا اے لبِ ساحل دینا

اگر استعارہ اس قدر کامل ہو اور اس میں ایسی لازمیت پائی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس میں تاثیر نہ ہو۔ استعارہ اس وقت بے اثر ہوتا ہے جب کہ وہ ہمارے کسی خیال یا جذبہ پر حاوی نہ ہو سکے۔ آسیؔ کا ہر استعارہ اضطراری ہوتا ہے اور اس میں آورد کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ ان کے دیوان میں ایسے اشعار کی بھی کثرت ہے جو سیدھے سادے ہیں اور جن کی تاثیر کا راز ان کی سادگی اور معصومیت میں ہے مثلاً اسی غزل کے یہ دو شعر:

ہائے رے ہائے تری عقدہ کشائی کے مزے
تو ہی کھولے جسے وہ عقدۂ مشکل دینا
درد کا کوئی محل ہی نہیں جب دل کے سوا
مجھ کو ہر عضو کے بدلے ہمہ تن دل دینا

یا یہ غزل:

پسند آئے تو لے لو دل ہمارا
مگر پھر دل بھی کس قابل ہمارا
چھری بھی تیز ظالم نے نہ کر لی
بڑا بے رحم تھا قاتل ہمارا
نہیں ہوتا کہ بڑھ کر ہاتھ رکھ دیں
تڑپتا دیکھتے ہیں دل ہمارا
نہ آنا ہم تمہارا دیکھ لیں گے
جو نکلا جذبِ دل کامل ہمارا

لیکن اسی غزل میں یہ شعر بھی ہے:

دلِ گردوں سے لے کر تا دلِ دوست
گیا تار کئی منزل ہمارا

ہم ان تمام منزلوں کو احاطہ کرنے سے قاصر ہیں جو ہمارے دل سے دلِ گردوں تک اور پھر دلِ گردوں سے دلِ دوست تک حائل ہیں اور جن کو ہمارا شاعر اس سہولت کے ساتھ بات کی بات میں طے کر گیا ہے۔ اس کے لیے جس کائناتی بصیرت COSMIC VISION اور جس مافوقی تخیل TRANSCENDENTAL IMAGINATION کی ضرورت ہے وہ ہر شخص کے نصیب کی چیز نہیں۔

آسیؔ کی شاعری اس بات کا پورا پتہ دیتی ہے کہ وہ صاحبِ کیف و حال تھے اور یہ کیف و

حال صوفیانہ سے کہیں زیادہ عاشقانہ تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ آسیؔ کے تجربہ میں کیف وحال کی یہ تقسیم بھی ہی نہیں۔ ان کا ہر شعر ایک وجد ہوتا ہے اور اس مقام کی خبر دیتا ہے جہاں خارجی اور داخلی میں کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں گرد و پیش کی ہر حالت ایک کیف باطن ہو جاتی ہے جہاں محبّت کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا اور "نظر و ناظر و منظور" سب مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ آسیؔ چونکہ زندگی اور محبت کے تمام درمیانی اور راوتی مراحل و منازل طے کر کے اس منزل پر پہنچے ہیں اور جن جن صعوبتوں اور مشقتوں سے ان کو دوچار ہونا پڑا ہے ان کو بھولے نہیں ہیں بلکہ ان کی ماہیت اور اہمیت کے اب بھی قائل ہیں اس لیے جب وہ کوئی بات کہتے ہیں تو اس میں ان مرحلوں اور صعوبتوں کی بھی پوری جھلک ہوتی ہے لیکن وہ بات ہوتی ہے ان کی اپنی منزل سے۔ اسی لیے ان کی شاعری ہمارے اندر کسی قسم کی دوری یا اجنبیت کا احساس پیدا کئے بغیر ہم کو غیر شعوری طور پر رفعت و تمکین کے احساس سے معمور کرتی رہتی ہے۔

آسیؔ کے کلام سے ہمارے اندر کبھی افسردگی یا بے دلی نہیں پیدا ہوتی جیسا کہ بعض دوسرے متغزلین کے مطالعہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کا سوز و گداز ہمارے دل میں ایک نئی تاب پیدا کر دیتا ہے۔ ان کی دردمندی میں نشاط کا ایک پہلو ہوتا ہے جو نمایاں ہوتا ہے۔ وہ محبّت کے غم کو زندگی کی اپج بنا دیتا ہے اسی وجہ سے ان کے کلام میں وہ اثر ہے جو میرؔ کی خاص شان ہے۔ ایک غزل کے کچھ اشعار سُنیے۔

اسی کے جلوے تھے لیکن وصالِ یار نہ تھا
میں اس کے واسطے کس وقت بے قرار نہ تھا

خرامِ جلوہ کے نقشِ قدم تھے لالہ و گل
کچھ اور اس کے سوا موسمِ بہار نہ تھا

غلط ہے حکمِ جہنم کسے ہوا ہو گا
کہ مجھ سے بڑھ کے تو کوئی گناہ گار نہ تھا

وفورِ بے خودیٔ بزمِ مے نہ پوچھو رات
کوئی بجز نگہِ یار ہوشیار نہ تھا

لحد کو کھول کے دیکھو تو اب کفن بھی نہیں
کوئی لباس نہ تھا جو کہ مستعار نہ تھا

تو محوِ گلبن و گلزار ہو گیا آسیؔ
تری نظر میں جمالِ خیالِ یار نہ تھا

آج تک میری نظر سے غالبؔ کے علاوہ اُردو میں کوئی شاعر ایسا نہیں گزرا ہے جس کی ایک ایک غزل میں اتنے اشعار قابلِ انتخاب نکل آتے ہوں اور اگر آپ لوگ انصاف کریں تو میرے اس انتخاب کو جوشِ عقیدت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ پہلے شعر میں وصل کا جو بلند اور ناقابلِ حصول تصور پیش کیا گیا ہے اور جس طرح یہ ذہن نشین کیا گیا ہے کہ تڑپتے رہنا عاشق کا فطری منصب ہے اس کی دوسری مثال مشکل سے ملے گی۔ دوسرے شعر میں ذوات و اعیان اور مظاہر و حوادث میں جو ازلی تعلق ہے اس کو جس حُسنِ اسلوب کے ساتھ واضح کیا گیا ہے وہ نہایت دل پذیر ہے۔ تیسرے شعر میں جس اعتماد اور جس اطمینان کے ساتھ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا اعتراف کیا گیا ہے وہ ان کمزوریوں اور خامیوں کو سراسر توانائی اور پختگی بنائے ہوئے ہے اس کے بعد کے دو شعر ایسا تیر کی طرح دل میں بیٹھ جاتے ہیں کہ شاید ہی کوئی نقادِ سخن ان کو انتخاب سے خارج کرنا گوارا کرے۔ مقطع میں استغراق کی جو نئی تخیل ہے اور جس حُسن کے ساتھ بیان کی گئی ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ شاعر "جمالِ یار" کے خیال میں نہیں بلکہ "خیالِ یار" کے جمال میں محو ہو جانے کی تحریک کر رہا ہے اور جو لوگ ایسا نہیں کر سکتے اور دوسرے مظاہر میں بہل جاتے ہیں ان کو موردِ طعن سمجھتا ہے۔

اگر محض فنی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو بھی آسیؔ کو ایک قادر الکلام شاعر ماننا پڑتا ہے۔ اسلوب اور زبان میں بھی ان کا ایک مرتبہ ہے۔ اگر وہ اثر و تاثیر میں متقدمین سے آنکھیں ملا سکتے ہیں تو زبان اور رعایات و تکلفات میں متاخرین سے بھی جو ہر کم نہیں ہیں اور پھر اس امتزاج کو انہوں نے کس قدر حسین اور دل فریب بنا دیا ہے۔ اب آخر میں ان کی غزلوں سے ہر قسم کے اشعار منتخب کر کے سُناتا ہوں تاکہ آسیؔ کے متعلق جتنی باتیں کی گئی ہیں ان کی خاطر خواہ تشریح و تائید ہو سکے۔

وفا دشمن ہو تم یا ہو جفا دوست
بہر صورت مجھے رہنا رضا دوست

کوئی دشمن ہو یا آسیؔ مرا دوست
ہیں سب کا دوست کیا دشمن ہو کیا دوست

ترقی اور تنزل کی نہ پوچھو
میں دشمن ہو گیا دشمن ہوا دوست

مجھے نیرنگِ دل نے مار ڈالا
یہ دشمن کا ہے دشمن دوست کا دوست

فریبِ عالمِ صورت سے بچنا
نہیں کوئی کسی کا جز خدا دوست

فقیروں کا بنا لو بھیس آسیؔ
وہ شاہنشاہِ خوباں ہے گدا دوست

عشق میں کہتے ہیں کامل آسیؔ دل گیر تھا
آہ جس کی بے اثر تھی نالہ بے تاثیر تھا

حالتِ دل خاک میں کہتا کہ تا ہنگامِ مرگ
آپ کا شکر جفا یا شکوۂ تقدیر تھا

عشق نے فرہاد کے پردے میں پایا انتقام
ایک مدت سے ہمارا خون دامن گیر تھا

وہ مصور تھا کوئی یا آپ کا حسنِ شباب
جس نے صورت دیکھ لی اک پیکرِ تصویر تھا

نقشِ دوجہاں گردشِ پیمانۂ دل تھا
کُن روزِ ازل نعرۂ مستانۂ دل تھا

خوشبو وہی رنگت وہی مستی بھی اسی کی
کعبہ میں بھی دورِ مئے میخانۂ دل تھا

ذوقِ غم و اندوہِ محبت کے میں صدقے
جو داغ دیا تم نے وہ جانانۂ دل تھا

آئینہ آپ کے نزدیک جو نامحرم ہے
آپ نے خاک نہ جانا کہ مجھے کیا غم ہے

عشق کہتا ہے دوعالم سے جدا ہو جانا
حسن کہتا ہے جدھر جاؤ نیا عالم ہے

میرے دشمن کو نہ مجھ پر کبھی قابو دینا
تم نے منہ پھیر لیا آہ یہی کیا کم ہے

ایک عالم کے طلسمات میں جی چھوٹ گیا
ہر ادائے نگہِ ناز نیا عالم ہے

قطرہ میں کچھ نہیں پانی کے سوا کیا کہیے
بات کہنے کی نہیں ہے بخدا کیا کہیے

لالہ و گل میں اُسی رشکِ چمن کی ہے بہار
باغ میں کون ہے اے بادِ صبا کیا کہیے

ایک ہستی کے سوا ہم نے نہ جانا کچھ بھی
اے میکرین اب اور اس کے سوا کیا کہیے

بہرصورت طلب لازم ہے آبِ زندگانی کی
اگر پایا خضر تم ہو نہ پایا تو سکندر ہو

کوئی توبی کے نکلے گا اڑے گی کچھ تو بُو منہ سے
درِ پیرِ مغاں پر سے پرستو چل کے بستر ہو

کسی کے در پہ آسیؔ رات رو رو کر یہ کہتا تھا
کہ آخر میں تمہارا بندہ ہوں تم بندہ پرور ہو

ایک جلوے کی ہوس وہ دمِ رحلت بھی نہیں
کچھ محبت نہیں ظالم تو مروّت بھی نہیں

جو دیا تو نے تری راہ میں سب کھو بیٹھے
ہاں اگر شکر نہیں ہے تو شکایت بھی نہیں

ٹکڑے ہو کر جو ملی کوہکن و مجنوں کو
کہیں وہ میری ہی پھوٹی ہوئی تقدیر نہ ہو

وہ بھی کچھ عشق ہے جو درد کی لذت نہ چکھے
وہ بھی نالہ ہے جو حسرت کشِ تاثیر نہ ہو

جس کو دیکھا اُسے چھاتی سے لگائے دیکھا
دل جسے کہتی ہے خلقت تری تصویر نہ ہو

حاصلِ صحبتِ غم ناک بجز غم کیا ہے
دل ملا لیتے ہو ڈرتا ہوں کہ دل گیر نہ ہو
صاف دیکھا ہے کہ غنچوں نے لہو تھوکا ہے
موسمِ گل میں الٰہی کوئی دل گیر نہ ہو

سوئے دشت ایک قدم ایک ترے گھر کی طرف
سر میں سودا ہے تو ملنے کی تمنا دل میں
داغوں میں روشنیٔ شمع سرِ طور ہے آج
کون ہے اے شبِ غم انجمن آرا دل میں

کس دشت میں عشق نے تھکایا
ہر ریگِ رواں ہے کارواں سوز
اس خلوتِ راز کے طلسمات
جو راز کھلا وہ راز داں سوز

یہ دونوں ایک ہی ترکش کے ہیں تیر
محبت اور مرگِ ناگہانی
علم کر خلد میں بھی خنجرِ ناز
تصدق ہے حیاتِ جاودانی

جو یہ کد ہے کوئی بلبل کی صورت نعرہ زن کیوں ہو
کوئی گل فام کیوں ہو گل بدن گل پیرہن کیوں ہو
تمہیں سچ سچ بتادو کون تھا شیریں کی صورت میں
کہ مشتِ خاک کی حسرت میں کوئی کوہکن کیوں ہو

اس کا بھی تو اب پتہ نہیں ہے
لائے تھے یہاں دلِ حزیں ہم

نون اس گھاٹ سے اُترا کہ جناب آسی
بوسہ لینے کو بڑھے ہیں لبِ ساحل کی طرف

دل جس سے مل گیا وہی نکلا بجائے دل
یا یوں کہو کہ کچھ بھی نہیں ہے سوائے دل

جنبش بھی کبھی اپنے ارادہ سے نہ کر
چلتے ہیں تو چلاتی ہے زنجیر ہماری

رات ہے رات تو بس مردِ خوش اوقات کی رات
گریۂ شوق کی یا ذوقِ مناجات کی رات

کمی نہ جوشِ جنوں میں نہ پاؤں میں طاقت
کوئی نہیں جو اُٹھا لائے گھر میں صحرا کو

نہ مرض کچھ ہے نہ آسیب نہ سایا ہم کو
اک پری زاد نے دیوانہ بنایا ہم کو

آج وہ ہیں مجمعِ احباب ہے
ایک مہجور آسیؔ بے تاب ہے

اور کیا چاہتی ہے آرزوئے دل ان سے
کچھ نہیں حسن کی سرکار میں حسرت کے سوا

یہ ہے آسیؔ کے کلام سے انتخاب۔ میں نے اوّل اوّل دو سو سے زائد اشعار کا انتخاب
کیا تھا لیکن پھر بیشتر ایسے اشعار کو نکال کر انتخاب کو مختصر کر دیا جو کافی مشہور و معروف ہیں۔ کہا جا سکتا ہے

کہ یہی غزل گوئی آسیؔ کا حاصل عمر ہے اس لیے کہ اُردو شاعری میں جو چیز ان کو ہمیشہ زندہ رکھے گی وہ ان کی غزل ہے۔ ان کی شاعری کی سب سے نمایاں شان ان کی غزلیت ہے جو ان کی رباعیوں میں بھی موجود ہے۔ رباعی کی صنف میں بھی آسیؔ کا ایک مرتبہ ہے۔ دو رباعیاں سُنا چکا ہوں چند اور سُنیے:

یا مجھ کو ترا حسُن نہ بھایا ہوتا
یا ہر رگ و پے میں تو سمایا ہوتا
یا دل ہی میں جلوہ گر اگر ہونا تھا
ہر جزوِ بدن کو دل بنایا ہوتا

کب تک کوئی اپنے دل کے غم کو روئے
کب تک کوئی یار کے ستم کو روئے
ہر دم یہ رُلا رہی ہے الفت جس کی
اللہ کرے کہ اب وہ ہم کو روئے

جن سے رہ و رسم کی وہ رہزن نکلے
بھولا جنھیں سمجھے تھے وہ پُرفن نکلے
جان اپنی جن احباب کو ہم سمجھے آہ
وہ دل کی طرح ہمارے دشمن نکلے

جس کی طبیعت میں یہ گداز اور جس کی زبان میں یہ نرمی ہو وہ کسی اور صنفِ سخن کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا۔ شاید عشقیہ مثنوی میں بھی آسیؔ کامیاب رہتے لیکن جس جذب وحال کے عالم میں وہ رہا کرتے تھے وہ مسلسل گوئی کے منافی تھا اسی لیے انہوں نے غزل رباعی کے سوا کسی اور صنف کی طرف توجہ نہیں کی۔ دو قصیدے لکھے ہیں جن میں ایک تو نواب کلب علی خاں والیِ رام پور کی شان میں ہے اور مکمل ہے۔ دوسرا میر محبوب علی خان نظام دکن کی مدح میں ہے اور نا تمام ہے۔ ان قصیدوں میں فن کے اعتبار سے کوئی بات قابلِ لحاظ نہیں ہے۔ البتہ تشبیب دونوں قصیدوں کی خوب ہیں اور خالص غزل کا حکم رکھتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کہاں ترا کوئی بحرِ وجود میں ثانی
حبابِ دیدۂ اہلِ نظر میں ہے پانی

بجے بہار لبِ گل سے "میں بہار" تو کیا
یہ شورِ کشتنِ منصور وائے نادانی
اگر یہ میں ہوں تو کیا تیری ذات ہے محدود
اگر یہ تو ہے تو پھر کیا وجودِ امکانی

دوسرا قصیدہ:

کسی کو دیکھ کے لغزش جو پاؤں میں آئی
شراب پی کر وہ آنکھیں نہ ہوں کہیں بدنام
بس اتنے پر کہ لبِ لعلِ یار چوم لیا
میرے فرشتے نے لکھا ہے مجھ کو مے آشام
کوئی کہے مجھے دیوانہ کوئی سودائی
تمہارے عشق نے کیا کیا کیا مجھے بدنام
کسی طرح کسی قالب میں انقلاب تو ہو
خدا کرے کہ جدائی ہو داخلِ ایام

آپ لوگوں کو شاید یہ شکایت ہو کہ میں نے خواہ مخواہ اتنا لمبا انتخاب پیش کر کے بات کو ضرورت سے زیادہ طول دے دیا جو محض میرے جذبۂ عقیدت اور بڑھے ہوئے حسنِ ظن کی دلیل ہے۔ اس کا ایک جواب تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تنقید بھی ادب ہی کی ایک صنف ہے اور لکھنے والے کے ذاتی ذوق اور اس کے اپنے جذبات سے کبھی الگ نہیں کی جا سکتی لیکن یقین مانیے میرا اصل مقصد یہ تھا کہ خود آپ کو بھی فیصلہ کرنے میں سہولت ہو اور آپ خود تسلیم کر لیں کہ جس شاعر کا دیوان ایسے اشعار سے بھرا پڑا ہو اس کی شاعری کو اردو شاعری کی تاریخ میں داخل نہ کرنا یا تو تصوف کا ایک غلط زعم اور بے جا رتبہ شناسی ہے یا پھر محض بدذوقی اور بے بصری۔ اب آخر میں چند اور اشعار سُنا کر اپنے مقالے کو ختم کرتا ہوں اور آپ لوگوں سے رخصت چاہتا ہوں:

اپنی عیسیٰ نفسی کی بھی تو کچھ شرم کرو
چشمِ بیمار کے بیمار ہیں بیمار ہنوز
کیا خراباتیوں کو حضرت آسیؔ نہ ملے
کہ سلامت ہے وہی جبّہ و دستار ہنوز

انہیں کانوں سے انا الحق کے سُنے ہیں نعرے
آدمی عشق میں کیسا جانیے کیا ہوتا ہے

ملنے کی یہی راہ نہ ملنے کی یہی راہ
دنیا جسے کہتے ہیں عجب راہ گزر ہے

اب کہیں آسیؔ نالاں ہے نہ قیس و فرہاد
کیا ہوئے کنگرۂ عرش ہلانے والے

بک گئے روزِ ازل پیرِ خرابات کے ہاتھ
ہم ہوئے تم ہوئے یا آسیؔ مے خوار ہُوا

مجنوںؔ گورکھپوری

(نکاتِ مجنوں)

اقتباسات

"حضرت آسیؔ کے کلام میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو مذاقِ سلیم کسی غزل میں تلاش کرتا ہے۔ اندازِ بیان کی متانت و پختگی، مضامین کا عُلوُ، خیالات کی بلندی، جذبات کی پاکیزگی و لطافت اُن کے کلام کے مخصوص عناصر ہیں اور یہی وہ خوبیاں ہیں جو اُن کے کلام کو نیرنگی و اعتبار کے بلند درجہ پر پہونچا دیتی ہیں۔ ایک خاص خوبی حضرت آسیؔ کے کلام کی یہ ہے کہ اُن کی غزلوں میں بھرتی کے شعر بالکل نہیں ہوتے اور سُوقیت و عامیانہ مذاق سے کلام پاک ہے۔ نیز جرأتؔ و داغؔ کی طرح ہوس ناکی، سفاہت بھی اُن کے یہاں پائی نہیں جاتی۔ آسیؔ ایک صاحبِ حال، صاحبِ دل، صاحبِ نسبت بزرگ تھے اس لیے فطرتاً اُن کا کلام تصوف کی چاشنی سے معمور ہے۔ وہ کبھی تو ایسے اشاراتِ صوفیانہ کر جاتے ہیں جس سے کلام کی رنگینی و رعنائی حد درجہ دل پذیری کی شان اختیار کر لیتی ہے اور کبھی کسی خاص مسئلہ تصوف پر شاعرانہ رنگ میں روشنی ڈال جاتے ہیں۔ اور کبھی مجاز کے پردہ میں رموزِ حقائق کی طلسم کشائی کر جاتے ہیں۔ چونکہ تصوف میں بھی حضرت آسیؔ کا مذاق وحدت الوجود کا ہے اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس مسئلہ پر وہ مختلف والہانہ اور مستانہ انداز سے اپنے وارداتِ قلب کو قالبِ شعر میں ڈھال کر پیش کر جاتے ہیں جن کو سُنتے ہی سامع پر ایک بے خودی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور مذاقِ سلیم پہروں سر دُھنتا ہے۔"

عارف ہسوی (مرحوم)

(نقل از "سمات الاخیار" مطبوعہ جونپور، یوپی، ۱۳۴۴ھ)

۲

"آسیؔ غازی پوری کے کلام کے بھی ہم دونوں عاشق تھے جسے لذّت لے لے کر ایک دوسرے کو سُناتے تھے اور جس پر دونوں مل کر تبصرے کیا کرتے تھے۔ کئی برس بعد ایسا ہوا کہ میں کان پور سناتن دھرم کالج میں پروفیسر ہو گیا اور مجنوںؔ جواب بی اے پاس کر چکے تھے گورکھ پور ہی میں تھے۔ ہم دونوں کے شعور اور وجدان کے باہمی ربط کا یہ کرشمہ تھا کہ بغیر ایک دوسرے کی خبر رکھے ہوئے ہم دونوں نے پچاس رباعیاں کہہ ڈالیں اور دونوں نے ایک دوسرے کو خط لکھا کہ آسیؔ کی رباعیوں

سے متاثر ہوکر یہ رباعیاں کہی گئی ہیں۔ ہم دونوں اب تک اس حسنِ اتفاق پر حیرت کرتے ہیں۔"

فراق گورکھ پوری

(مضمون "مجنوں گورکھ پوری" نقوش لاہور شخصیات نمبر ص ۲۹۶
جنوری ۱۹۵۵ء)

۳

"ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر سید محمود مرحوم سابق وزیرِ خارجہ حکومتِ ہند) کو جونپور کی خانقاہِ رشیدیہ سے بھی بڑا گہرا روحانی تعلق تھا۔ یہ تو یقینی طور پر معلوم نہیں کہ وہ اس سلسلہ میں بیعت بھی تھے لیکن ان کو اسی سلسلہ کے مشہور شیخ مولانا عبدالعلیم آسی غازی پوری سے ایسی عقیدت و وابستگی تھی کہ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ اپنی نوجوانی میں ان سے بیعت ہو گئے تھے، اپنی زندگی کے آخری دور میں وہ ان کا کلام بڑے شغف اور جوشِ عقیدت کے ساتھ پڑھتے تھے اور اکثر ان کا تذکرہ فرماتے تھے۔"

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

('پرانے چراغ' کراچی ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۷۵ء ص ۳۸۴
بابت ڈاکٹر سید محمود مرحوم)

۴

"اس سفر (بسلسلۂ مقدمۂ کراچی) میں رات کے طول طویل گھنٹے درود و سلام کی تسبیحیں پڑھتے پڑھتے گزار دیئے اور آسی غازی پوری کا یہ شعر سارے سفر میں برابر وردِ زبان رہا ؎

وہاں پہونچ کے یہ کہنا صبا سلام کے بعد
تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد"

مولانا محمد علی جوہر

(قومی ڈائجسٹ' لاہور' اپریل ۱۹۸۸ء، ص ۱۶۱)